وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا

اور جس کو حکمت و دانائی عطا ہوئی، اس کو بہت بڑی بھلائی ملی۔ (البقرۃ - ۲۶۹)

آثار و افکار

کریم بخش خالد

پندرھویں صدی ہجری مطبوعات کراچی - ۷۴۴۰۰

پندرھویں صدی ہجری مطبوعات - ۶

کتاب : آثار و افکار

مصنّف : کریم بخش خالد

سرِورق : آذر زوبی

تزئین : سلطان احمد جیلانی ، محمد اقبال

مطبع : ایجوکیشنل پریس، ضیاءالدین احمد روڈ، کراچی

تعداد : ایک ہزار (دسمبر ۱۹۸۹)

قیمت : ۱۲۵ (سواسو) روپے

NAME OF BOOK: ĀSĀR-O-AFKĀR

AUTHOR: KARIM BAKHSH KHALID

COVER DESIGN: OZZIR ZUBY

PUBLISHER: PANDERAHEEN SADI HIJRI PUBLICATIONS, C-1/4, JACOBLINES HOUSING COMPLEX, KARACHI- 74400

FIRST EDITION: DECEMBER 1989 1000 COPIES

PRINTER: EDUCATIONAL PRESS, ZIAUDDING AHMAD ROAD, KARACHI.

PRICE: Rs.125

پاکستان میں نظامِ تعلیم کی تشکیلِ نو

(علامہ سید سلیمان ندویؒ کی ایک یادگار تقریر)

انیسویں صدی عیسوی کی آخری چوتھائی میں برطانوی سامراج ہندوستان کے طول و عرض پر مسلط ہو چکا تھا، اس دور ابتلا میں چار ایسی نمایاں شخصیتیں پیدا ہوئیں جنہوں نے اپنے قول و کردار سے تاریخ کے دھارے کو موڑ دیا۔ وہ قدیم و جدید فکر کی حامل، متضاد ماحول و معاشرت کی پیداوار اور شکل و سیرت میں بھی مختلف تھیں لیکن ان کے ذہن اور مافی الضمیر میں ایک ہی جذبہ اور اُمنگ تھی کہ ہندوستانی مسلمان غلامی سے چھٹکارا حاصل کر سکیں اور اپنے خود مختار ملک میں آزادی سے نہ صرف اسلامی تعلیم کو عملی طور پر فروغ دیں بلکہ مامور من اللہ قوم کی حیثیت سے دنیا میں اپنا تاریخی کردار بھی ادا کریں۔ یہ اکابرین ملت تھے قائداعظم محمد علی جناح (ولادت ۱۸۷۶)، ڈاکٹر سر محمد اقبال (ولادت ۱۸۷۷)، مولانا محمد علی جوہر (ولادت ۱۸۷۸) اور علامہ سید سلیمان ندوی (ولادت ۱۸۸۴)۔

علامہ سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴-۱۹۵۳) کے بارے میں کچھ بیان کرنے کے لئے وسیع مطالعے اور عمیق فکر کی ضرورت ہے کیونکہ وہ اسلامی علوم و فنون کے بحرِ بے کراں تھے۔ ان کے قلم سے جو تحریریں اور تصانیف تاریخ، ادب، فلسفہ، سیاست، شاعری، سوانح اور علمی تحقیق کے سلسلے میں ہمارے سامنے آئی ہیں، ان کی وجہ سے نہ صرف وہ زندہ جاوید ہو چکے ہیں بلکہ جس کسی کو بھی ان کے مطالعے

کی سعادت حاصل ہوئی وہ صاحب فکر و نظر بن گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب "متجمع الصفات" عالم و صوفی تھے۔ بقول مولانا انور شاہ کاشمیری "اگر رازی اور غزالی کا علم اور جنید و شبلی کا تقویٰ کہیں ایک جگہ جمع ہو جائے تو اس مجموعے سے ایک سید سلیمان ندوی بن سکے گا۔" ان کی باتیں شیریں الفاظ اور شیریں اندازِ بیاں سے مزین ہوتی تھیں اور جامعیت اور قطعیت کا درجہ رکھتی تھیں۔ وہ شریف النفس، خاموش طبع عالم تھے جو ہمارے باہمی اختلافات کی اُلجھنوں سے اپنا پہلو بچا کر عالم اسلام کی خدمت کرتے رہے۔ تاہم دینی اور دنیوی تحریکات سے کبھی غافل نہ رہے۔ تلوار ہاتھ میں نہ ہو تو آدمی آفات کا مقابلہ علم و فکر کی مدد سے کرتا ہے۔ سید صاحب نے اپنے قلم سے "صلاحِ دین" اور "فلاحِ دنیا" کا کام کیا۔ ان کا ایک عظیم کارنامہ سیرت النبیؐ (۱۹۲۰-۱۹۳۸) جو آج بھی عوام و خواص میں یکساں طور پر مقبول ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی بے پناہ عقیدت اور محبت کی گواہی دیتا ہے۔ علاوہ ازیں ارض القرآن (۱۹۱۶-۱۹۱۸)، حیاتِ مالک (۱۹۱۷)، سیرت عائشہ (۱۹۲۴) خطباتِ مدراس (۱۹۲۶)، عرب و ہند کے تعلقات (۱۹۳۰)، خیام (۱۹۳۳)، عربوں کی جہاز رانی (۱۹۳۵)، رحمتِ عالم (۱۹۴۰) اور حیاتِ شبلی (۱۹۴۳)، ایسی تصنیفات ہیں جنہوں نے اردو ادب کو لازوال عظمت بخشی اور نئی نسل کی رہنمائی و رہبری کے لئے تاریخی تحقیق اور ادبی اسلوب کی جدید اور روشن راہ متعین کی۔

سید صاحب کے ہندوستانی اور اردو زبان و ادب سے متعلق پانچ خطبات پندرہ مقالات اور گیارہ مقدمات کا مجموعہ جو نقوشِ سلیمانی (۱۹۳۶) کے نام سے ان کی زندگی میں ہی شائع ہوا، مقالاتِ سلیمانی (حصہ اول) ہندوستان کی تاریخ کے

مختلف پہلوؤں پر مضامین، مقالات (حصہ دوم) تحقیقی اور علمی مضامین مقالات (حصہ سوم)، مذہبی و قرآنی مضامین، تاریخی معلومات کا مستند مخزن ہیں۔ علاوہ ازیں 'یادِ رفتگاں' (۱۹۵۷) جو نصف صدی کی داستانِ غم اور درد بھری کہانی ہے ان تعزیتی تاثرات پر مشتمل ہے جو سید صاحب نے ماہنامہ 'معارف' میں ۱۹۱۴ سے لے کر اپنی وفات سے کچھ پہلے ۱۹۵۳ تک اپنے ہمعصروں کے انتقال پر تحریر فرمائے تھے۔ ان مضامین میں ہم سے بچھڑنے والوں کے تذکرہ کے ساتھ سید صاحب کی اپنی زندگی کا پرتو بھی نظر آتا ہے۔

ان نگارشات کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ ندوی ایک روشن خیال صاحبِ قلم عالم اور دورِ حاضر کے اسلوبِ فکر سے کماحقہٗ واقف تھے۔ ان کے اندازِ تحریر میں گہرائی اور گیرائی ہے جس نے ہر صاحبِ فہم کے قلب و نظر پر ایک گہرا اثر چھوڑا ہے۔ نیز ڈاکٹر سر محمد اقبال کے قول کی تصدیق ہوتی ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی 'امیر علماء'، 'رئیس المصنفین' اور علوم اسلام کی جوئے شیر کے فرہاد تھے۔

مجھے سندھ مسلم کالج میں زمانۂ طالب علمی کے دوران علامہ سید سلیمان ندوی کی دست بوسی کا شرف حاصل ہوا اور ان کی تحریروں اور تقریروں سے مستفید ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ مجھے جب بھی وہ لمحات یاد آتے ہیں تو اپنی خوش قسمتی پر فخر محسوس کرتا ہوں کہ ایک زمانہ کے بعد مجھے بھی ایک ایسی نابغۂ روزگار ہستی کو دیکھنے، سننے اور ان کے ارشادات عالیہ سے فیض حاصل کرنے کا موقع ملا جن کے نورانی چہرہ، دھیمہ لہجہ، شفقت بھری نگاہوں اور مشفقانہ رویہ سے قرونِ اولیٰ کے صحابہ کرام کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ یہ یادگار ساعتیں میری زندگی کا عظیم سرمایہ

اور رہنما تاثر ہیں۔ میں بی۔ اے کے تیسرے سال میں پڑھتا تھا اور ساتھ ہی سندھی روزنامہ 'الوحید' میں صحافت کی تربیت حاصل کرتا تھا۔ ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۵۰ کو علامہ سید سلیمان ندوی ہمارے کالج میں تشریف لائے اور 'اسلامی نظریہ تعلیم' کے موضوع پر خطاب کیا۔ ہمارے پرنسپل پروفیسر سید غلام مصطفیٰ شاہ نے اپنے استقبالیہ خطبہ میں علامہ موصوف کی عالم اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور علوم اسلامیہ کے احیاء اور فروغ کے سلسلے میں خدمات کا اعادہ کیا۔

علامہ ندوی نے اپنی فی البدیہہ اور عالمانہ تقریر میں سینتیس (۳۷) برس پہلے ہماری ان کمزوریوں کی نشاندہی کی تھی جن کی وجہ سے آج بھی ہم بہت حیران اور پریشان ہیں۔ قومی تشخص مجروح ہے اور کردار کی جگہ گفتار نے لے لی ہے۔ قومیتوں کا چکر، انگریزی زبان کی اپنی مادری زبان پر فوقیت، مغربی ثقافت کی نقالی، اسلام کو کامل ضابطۂ حیات ماننے کے بجائے پرائیویٹ اور پرسنل معاملہ سمجھنا، سیاسی آزادی حاصل کرنے کے باوجود ذہنی غلامی میں مبتلا رہنا، تعلیمی توسیعی سرگرمیوں اور کتب خانوں کا فقدان، بعض کمزوریاں ہیں جو ہماری قومی زندگی کی فعالیت اور تابندگی کو ختم کر رہی ہیں۔ علامہ صاحب نے کہا تھا کہ "پولیس اور فوج کے ذریعے شر اور جرائم کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ شر کا خاتمہ اس وقت ہو سکتا ہے جب یہ عقیدہ جان گزیں ہو جائے کہ کوئی دیکھے نہ دیکھے خدا ضرور دیکھتا ہے۔"

علامہ سید سلیمان ندوی کی اس تاریخی تقریر کا متن مختلف جرائد و اخبارات کی رپورٹوں اور عجلت میں لکھے ہوئے مسودے کی تدوین کے بعد پیش کر رہا ہوں

مجھے یقین ہے کہ اس میں علامہ موصوف کی تقریر کے سب نکات کا ماحصل آگیا ہوگا۔

(کریم بخش خالد)

انگریزی حکومت کے دوصد سالہ دورِ غلامی میں حاکم قوم نے یہ کوشش کی کہ محکوم قوم کی تعلیم کو مذہب سے بے رنگ اور کورا کر دیا جائے تاکہ ان کے مذہبی جذبات سرد پڑ جائیں اور ان کی قوت مدافعت کم ہوتی چلی جائے۔ انگریز اس مقصد میں دونوں طرح سے کامیاب ہوئے۔ مسلمانوں کو مذہبی تعلیم سے عاری اور بے بہرہ رکھا اور اس طرح خود اپنے تمدن و تہذیب اور اپنے افکار و خیالات سے ان کو متاثر کر لیا جس سے خود اپنی ملت سے بے اعتنائی اور انگریزی طور طریق کی نقالی ان کا جزوِ زندگی بن گئی۔

اب جبکہ پاکستان وجود میں آچکا ہے تو ہم کو سوچنا ہے کہ اب ہماری تعلیم کا کیا نظریہ اور مقصد ہونا چاہیئے۔ اب وقت ہے اور ضرورت ہے کہ گزشتہ دورِ غلامی کے نصاب کو یک لخت بدل دیا جائے اور پھر اسی راہ اور راستہ پر ہمارے کاروانِ علم کو چلایا جائے جس پر وہ تیرہ سو برس سے چل رہا ہے۔ مسلمانوں کے گزشتہ عہدِ ترقی کے زمانے میں طالبِ علموں کو مذہبی علوم کے ساتھ عقلی علوم و فنون کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ ایک مسلمان طالبِ علم اور عالم نہ صرف دینیات کا عالم ہوتا تھا بلکہ وہ عقلیت کا بھی ماہر ہوتا تھا۔ علوم عمرانی، تاریخ و جغرافیا، معاشیات و سیاسیات، فلکیات و نجومیات، ریاضی و الجبرا پر بھی اس کو مہارتِ تامہ و عبورِ کامل ہوتا تھا۔ فیثاغورث اور بطلیموس، افلاطون اور ارسطو کی تحقیقات پر وہ روشنی بھی ڈالتے تھے اور ساتھ ہی قال اللہ اور قال الرسول

کا ترانہ بھی ان کے دہنوں سے بلند ہوتا تھا۔ قابلِ غور چیز یہ ہے کہ جہاں تک خلافتِ راشدہ کے دور کا تعلق ہے وہاں علوم دین و دنیا کی تفریق نہ تھی۔ یہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ملکوں کے فاتح و کشور بھی تھے اور علومِ دین کے مدرس اور قرآن پاک کے حافظ اور احادیث کے شارح اور مسائل کے مفتی بھی تھے۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت علیؓ وہ علما تھے جن سے نہ صرف مسائل دریافت کئے جاتے تھے بلکہ معاملات بھی معلوم کئے جاتے تھے۔ مشہور مورخ اور ادیب گبن نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ وہ ہیں جو ہر نئے چاند کے ساتھ ایک نیا شہر فتح کرتے تھے۔ وہی فاتح و کشور کشا خلیفۂ وقت فتوحات کے ساتھ احکام و فتاویٰ اور محراب و منبر کی بھی زینت تھے۔ ان بزرگوں نے نہ صرف علوم پر فتح پائی تھی بلکہ ملک اور شہر بھی فتح کئے تھے۔ یہ تو مسلمانوں کا معیاری دور تھا۔ اس کے بعد وہ زمانہ آیا جب علما کو مختلف ذوق کی بنا پر مختلف ناموں سے یاد کیا گیا۔ جنہوں نے علوم حدیث پر عبور حاصل کیا وہ محدث کہلائے، جن کو علوم فقہی سے دلچسپی تھی وہ فقیہہ ہو گئے۔ اسی طرح سے مختلف علوم کے کامل پیدا ہوئے جس طرح کسی وسیع و عریض مملکت اور حکومت کے محکمے اور شعبہ جات ہوتے ہیں، اس طرح علومِ اسلامی کے مختلف شعبے ہو گئے اور ان کو علیحدہ علیحدہ نام دیئے گئے۔ امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام حنبلؒ وغیرہ محدث تھے جنہوں نے علم حدیث کے حفظ و تدوین کا کام انجام دیا۔ امام ابوحنیفہ مجتہد تھے۔ یہ لوگ دلائل کتاب و سنت سے احکام کا استنباط کرتے تھے اور کلیات سے جزئیات نکالتے تھے۔ ان مجتہدین کرام کی ایک ایک کوشش کا ہم کو ممنون ہونا

چاہیئے کہ انہوں نے ان ملوک کے ناجائز اور غلط تعریف سے اسلامی تعلیمات کو بچالیا۔ انہوں نے احکامِ فقہی کو اپنے اجتہاد و استنباط سے مدوّن کرکے یہ سارا دفتر ملّت کے سپرد کیا جو آج حنفی و مالکی و شافعی و حنبلی ناموں سے مشہور رہے۔ ان کے بانی وہ حضرات ہیں جو سلاطینِ وقت سے کوئی تعلق نہیں رکھتے بلکہ ان میں سے اکثر نے جابر سلاطین کے ہاتھوں سے اذیت اُٹھائی ہے۔

جب علوم نقلیہ کی تدوین کے بعد عہدِ عباسیہ میں علوم عقلیہ کا رواج ہوا تو اس گروہ سے کچھ افراد نے دین کی خدمت کی خاطر ان علوم کو بھی حاصل کیا اور ان کے مضر اثرات سے ملّت کو بچانے کی خاطر "علم کلام" ایجاد کیا۔ ان خدمات کے انجام دینے کے لئے مختلف مسلمان قوموں نے اپنے اپنے فرض کو انجام دیا۔ پہلا مسلمان فلسفی یعقوب کندی تھا۔ ابونصر فارابی قومیت کے لحاظ سے ترک تھا۔ شیخ بوعلی سینا کی قومیت ایرانی تھی۔ ابنِ رشد یورپ کے مسلمان اور عرب تھے جنہوں نے ارسطو کے خیالات کی ترجمانی کی۔

مگر قومیتوں اور نسلوں کے اس اختلافات نے اصل مقصد میں کوئی فرق پیدا نہیں کیا۔ مسلمان کبھی بھی کسی قوم کا نام نہیں ہے۔ جس طرح سے ہندی، ایرانی، چینی، جاپانی، انگریز، قوموں کے نام ہیں جن کی نسبت رنگ و نسل و زمین کی وجہ سے ہے۔ مسلم کی بنیاد نسل و رنگ و قومیت کی بنا پر نہیں ہوتی بلکہ اس کی بنیاد چند خاص اصول و عقائد پر ہے۔ خواہ کوئی شخص کسی خطہ ارض یا قوم کا رکن ہو اگر وہ ان عقائد کی تکمیل کرتا ہے تو مسلم ہے۔ دنیا میں قومیں ہزاروں ہیں اس لئے انکے اندر وحدت پیدا کرنے کی تدبیر جدا جدا وطنی و نسلی قومیتوں پر زور دینا نہیں ہے نہ ان مادی تفرقوں پر زور دینا ہے کیونکہ یہ تفرقے مٹ نہیں سکتے۔ کوئی چینی، جاپانی، ترکی یا ہندی

نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے بجائے ذہنی انکار پر اس کی بنیاد رکھی جائے جس پر قوموں کا اتفاق ممکن ہوسکتا ہے۔ ان ہی فکری اتحاد کے نظریوں میں سے ایک اسلام کا نظریہ بھی ہے جس نے دنیا کے چالیس کروڑ انسانوں کو ایک واحد قوم بنا دیا۔ جو کبھی دنیائے اسلام میں ایک سلطنت رکھتے تھے جیسا کہ ۱۳۳ھ تک تھا کہ سندھ سے لے کر اسپین تک ایک اسلامی سلطنت تھی۔ اس کے بعد اموی اور عباسی دور میں انکی تفریقیں ہوگئیں۔ پھر یہ تفریقیں خاندانی اور قومی حکومتوں کے ساتھ بڑھتی ہی رہیں۔ بایں ہمہ ایک نظریہ حیات اور ایک عقیدہ کی وحدت اب بھی ان کے اندرونی وحدت کا سررشتہ ہے۔ ایک قابل غور چیز یہ ہے کہ دنیا کے کسی حصہ میں بھی ایک ملک کا مسلمان دوسرے ملک کے مسلمان سے جب ملتا ہے تو اس کو ایک روحانی وحدت سی محسوس ہوتی ہے اور ایک برادری کے فرد ہونے کا احساس دونوں کو ہوتا ہے۔ گزشتہ زمانے میں جب اسلام دنیا کی قوتِ غالبہ تھی تو دنیا کے ہر گوشے میں جہاں ان کا قدم پہنچ جاتا تھا دنیا کی ایک ممتاز ملّت کی حیثیت سے اس کا احترام کیا جاتا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے زمانے کے علوم و فنون اور جنگجو و سیاسی و تجارتی قوتوں کے حامل تھے۔

لیکن آج بدنصیبی یہ ہے کہ مسلمانوں کی قوتِ غالبہ غائب ہوچکی ہے۔ تاریخ گزشتہ کے اوراق اُلٹیے تو پتہ چلے گا کہ ہندوستان میں مالابار، گجرات اور دوسرے مقامات پر جہاں مسلمانوں کی حکومت نہ تھی ان کی فقط تاجرانہ آمد و رفت تھی، مسلمانوں کی کس قدر عزت و توقیر کی جاتی تھی۔ انکے مقدمات ان کی شریعت کے مطابق ان کے قاضی فیصل کرتے تھے جن کو "ہنرمند"

کہتے تھے اور جن کو وہاں کی مقامی حکومت مقرر کرتی تھی۔ وہاں کے راجاان سے تجارتی اور جنگی و بحری خدمات میں کام لیتے تھے اور ان کی قدر کرتے تھے۔ کیونکہ وہ اپنے وقت کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوم تھے اور ان کی قوت دنیا کی قوت غالبہ تھی اور اگر آج بھی مسلمان اپنے نظریہ حیات پر قائم اور عمل پیرا ہوں اور اپنے جوہرِ اصلی کو پہچان لیں تو وہ آج پھر قوتِ غالبہ بن سکتے ہیں۔ کس کو معلوم تھا کہ کبھی پاکستان بنے گا۔ کون جانتا تھا کہ انڈونیشیا کی سلطنت کا وجود ہوگا یا حکومت عثمانی اور ترکی سلطنت کے زوال کے بعد عربوں کی مختلف چھوٹی چھوٹی سلطنتیں پیدا ہوجائیں گی۔ ایشیا کی مردہ لاش میں پھر حرکت پیدا ہوگی۔ مسلمان کو جس چیز نے تباہ و برباد کیا وہ تعلیم تھی جو ان کی دینی حرارت کو فنا کرنے کی خاطر یورپ کی حاکم قوتوں نے ان میں رائج کی۔ اس غلط اور غیر مذہبی تعلیم کے اثرات کی بدولت ہم اپنے آپ کو بھول گئے ہیں۔ اپنے فرائض سے بے علم اور بے خبر ہو چکے ہیں۔ ہم اس غلط راہ پر چلنے لگے اور اس غلط طریق پر سوچنے لگے جس کی کہ ہم کو تعلیم دی گئی تھی۔ اس طرح وہی غلط راہ روی ہماری زندگی کا مقصد بن گئی۔ اب ہم کو اپنے لباس اپنی معاشرت اور اپنے ملی طرزِ تخیل اور قوتِ فکر کی ضرورت ہے کیونکہ دراصل ذہنی آزادی کا نام ہی حقیقی اور اصل آزادی ہے اور ذہنی آزادی کی پیدائش اہلِ قلم کی تصنیفات اور اہلِ فکر کی تحریرات سے ہوتی ہے۔ صرف مادی ترقی یا کسی ملک کے سطحِ وجود پر آجانے پر خوشی منانا بالکل اسی طرح ہے جس طرح کسی کے گھر بچہ کی ولادت پر مخنثوں کو خوشی ہو۔ اصلی مسرت اور خوشی کا مقام وہ ہے

جبکہ ہم اپنے نظریہ کے مطابق تعمیری کام کریں اور علوم و فنون کو اپنی مادری زبان میں حاصل کریں۔ صرف انگریزی زبان جاننا علم نہیں ہے جس کے لیے ہم سب کچھ برباد کر رہے ہیں۔

بلاشبہ یہ ضروری ہے کہ ہم کو مختلف ملکوں کی زبانوں کا علم ہونا چاہیئے لیکن اگر یہ تصور کر لیا جائے کہ صرف انگریزی دانی میں ہی کمال اصل فضیلت ہے تو یہ جہالت ہوگی۔ دنیا کی ہر زبان ضرورت کے لحاظ سے برابر ہے۔ تجارت اور سیاست اور دوسرے بین الملکی ضرورتوں کے لحاظ سے انگریزی، جرمن، فرنچ اور ہر زبان کے جاننے والوں کو ملک میں موجود رہنا چاہیئے۔ اس لئے ان تمام غیر ملکی زبانوں کی یکساں حیثیت ہے۔ لیکن اپنی دفتری سرکاری تعلیمی اور ملکی زبان وہی ہونی چاہیئے جو ہمارے ملک کی عام زبان ہے۔ دنیا کی کسی قوم نے کسی غیر ملکی زبان کے حصول سے ملک کے علم و فن اور تہذیب و تمدن میں ترقی نہیں کی ہے۔

گو علم ہر جگہ سے اور ہر زبان سے اخذ کرنا چاہیئے۔ الحکمۃ ضالۃ المومن محیث وجدھا فھو احق بہا۔ حکمت و دانائی ایک مومن کا گمشدہ مال ہے وہ جہاں اس کو پالے اس کا مستحق ہے لیکن یہ تمام علوم و فنون دین و ملت کے خادم بن کر سیکھے سکھائے جائیں تاکہ ان کو دین سے نصرت ہو۔

اسلام کو عملی زندگی میں نافذ اور جاری کرنا ہمارا فرض ہے اور یہ صحیح تعلیم اور نیک صحبت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ بھی عجیب واقعات پیش کرتی ہے۔ ابتدائی دور میں ہمارے آباو اجداد انگریزی

پڑھانا کفر سمجھتے تھے لیکن سر سید احمد خان مرحوم اور ان کے رفقا کی کوششوں سے جو انگریزی تعلیم پھیلی تو ایسی پھیلی کہ صرف تعلیم ہی انگریزی نہیں ہوئی بلکہ تربیت اور تمدن اور تہذیب اور شکل و صورت بھی انگریزی ہو گئی۔ سر سید احمد خان مرحوم، نواب محسن الملک، مولانا حالیؔ، مولانا نذیر احمد، مولانا شبلیؔ عالم تھے۔ نواب وقار الملک بزرگوں کے صحبت یافتہ تھے اور بڑے دین دار تھے۔ انہوں نے ملک میں جدید تعلیم کو رائج کیا۔ لیکن دیکھئے کہ ان کی تربیت خالص مشرقی تھی۔ ان سب کے چہروں پر داڑھی دیکھئے۔ انگریزی تعلیم کے سب سے اوّل نمونہ جسٹس محمود کو دیکھئے جو انگریزی اور عربی بھی جانتے تھے ان کے چہرہ پر بھی داڑھی نظر آئے گی۔ پھر رفتہ رفتہ یہ چیز غائب ہونے لگی یہاں تک کہ اب داڑھی کے ساتھ مونچھیں بھی غائب ہو گئیں۔ آجکل یہ معمولی چیز سمجھی جاتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ملت کی تعمیر میں چھوٹی چھوٹی چیزیں بہت بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان ہی کے مجموعے سے مل کر کسی قوم کی تہذیب و تمدن اور کلچر تیار ہوتا ہے اور قومی انفرادیت نمودار ہوتی ہے۔

آجکل مسلمانوں نے عیسوی مذہب کی طرح اسلام کو بھی صرف چند پرائیویٹ خیالات کا مجموعہ سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ اسلام بجائے خود ایک مکمل نظامِ حیات ہے۔ امریکہ کی جمہوریت اور روس کی کمیونزم کی طرح اسلام اپنا ضابطۂ زندگی اور نظام قانون رکھتا ہے۔ دنیا میں تیرہ سو برس کے اندر سینکڑوں اسلامی سلطنتیں قائم ہوئیں۔ ہزاروں خاندانوں نے حکومتیں کیں اور گو یہ اپنی انفرادی زندگی اور حکمرانوں کے اصول انتخاب اور بیت المال کی احتیاطوں میں بے پرواہ رہے لیکن ان میں سے کوئی سلطنت ایسی نہیں ہوئی جس میں

معاملات کا قانون اور فصل مقدمات کے اصول اسلامی نہ ہوں۔ اکثر سلطنتیں حنفی ہوئی ہیں۔ ان کی بنیاد حنفی مذہب پر تھی۔ مختلف زبانوں میں قانون کی کتابیں "فتاویٰ" کے نام سے مرتب ہوئیں اور آخر میں عالمگیر کے زمانے میں "فتاویٰ عالمگیری" لکھی گئی۔ شروع میں انگریزوں نے بھی اس اسلامی قانون پر عمل کیا۔ حنفی فقہ کے متعلق فارسی میں کتابیں لکھوائیں جن کے مطابق فیصلے ہوتے تھے۔ بعد کو انگریزوں نے اپنا قانون بنا کر ملک میں رائج کیا جس کی بنیاد رومن قانون اور برٹش لا کے طریق پر رکھی۔ یہ نکتہ خاص سمجھنے کے قابل ہے کہ قانون کا منشا برائیوں کا استیصال اور ملک میں امن و امان کا قیام ہے۔ اس لئے اسلامی قانون کا دوسرے قانون سے اختلاف اس کے بطلان اور خرابی کی دلیل نہیں ہے۔ فرنچ قانون جرمن قانون سے، امریکن قانون برٹش قانون سے مختلف ہو سکتا ہے اور یہ بعض معاملات میں مختلف ہیں لیکن محض برٹش قانون سے کسی قانون کا مختلف ہونا برائی کی دلیل نہیں ہے۔ انگریزی قانون میں قاتل کے لئے قتل کی سزا ہے اور حکومت مدعی ہوتی ہے اور سزا قتل ہوتی ہے۔ اسلام کے قانون میں مدعی مقتول کے ورثا ہیں اور ان کو حق ہے کہ چاہیں تو مقتول کے بدلے بطور قصاص قاتل کو قتل کریں یا خون بہا لیکر یا بلا خون بہائے معاف کر دیں۔ ورثا کے معاف کر دینے کے بعد حکومت تعزیراً چاہے تو قتل کے سوا دوسری سزا دے سکتی ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی قانونِ قصاص کے جاری ہونے سے قتل کے جرائم میں اضافہ ہو جائے گا وہ سخت غلطی پر ہیں۔ کیا وہ ثابت کر سکتے ہیں کہ انگریزی قانون کے زمانے میں قتل کے جرائم اس زمانہ سے بھی کم ہوں گے جب ملک میں

اسلامی قانون جاری تھا۔ خود انگریزی عہد میں بھی ہندوستان کی اسلامی ریاستوں مثلاً حیدرآباد اور بھوپال میں ایک حیثیت سے اسلامی قانونِ قصاص کا رواج تھا، تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ برٹش انڈیا کے مقابلے میں حیدرآباد اور بھوپال میں جرائم کی کثرت ہو گئی تھی۔ آج بھی ابنِ سعود کی مملکت میں جہاں اسلامی قانون جاری ہے دوسرے غیر اسلامی ملکوں کے مقابلے میں جہاں غیر اسلامی قانون جاری ہے جرائم کی تعداد کم ہے۔

کسی قوم کا دوسری قوموں کے مقابلے میں خود کو کمتر یا بالاتر سمجھنا احساسِ کمتری کی دلیل ہے۔ گو ہم کو انگریزوں نے آزاد کر دیا ہے لیکن ذہنی طور سے سیاسی آزادی کے بعد بھی ہم بعینہ غلام ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی آقا اپنے غلام کو آزاد کر بھی دیتا ہے تو ایک مدت کی غلامی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ جب یہ آزاد کردہ غلام پرانے آقا کے سامنے آتا ہے تو جھک کر سلام کرتا ہے۔ برابری سے اس کے مقابل نہیں بیٹھ سکتا۔ یہی ذہنیت آج بھی ہمارے اندر ہے جو زہرِ ہلاہل کی طرح ہماری زندگی کو دھمکی دے رہی ہے۔ خیر یہ تو ایک ضمنی بحث تھی۔ مقصد یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کو ایک مستقل حیات کے اجزاء و عناصر کو یکجا کرنا ہے اور گزشتہ تاریخ کے منتشر اور پراگندہ اوراق کو یکجا کرنا ہے اور زمانہ کے مقتضیات اور مصالح کو سامنے رکھ کر رنگ و روپ میں تغیر کرنا ہے۔ اب آبِ حیات پیالوں کے بجائے خوبصورت گلاسوں میں پیش کرنا ہے۔ جس طرح قرآنِ پاک کے متن کو بعض نفاست پسند مطابع چکنے اور عمدہ رنگین کاغذ پر اور لطیف جلدوں میں شائع کر رہے ہیں لیکن قرآنِ پاک متن کے لحاظ سے وہی پرانا قرآن ہے۔ صرف اس کی آب و تاب موجودہ زمانے کے مطابق کر دی گئی ہے۔ اس طرح اگر ہم اپنے پرانے تمدن میں تجدید پیدا کرلیں

تو ہم انفرادیت کے ساتھ زمانے کا ساتھ بھی دے سکتے ہیں بشرطیکہ یہ تجدد حدودِ مباح کے اندر رہو۔

کراچی میں تجارتی چہل پہل تو رونق پر ہے مگر یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ابھی تک یہاں پر علمی اور تعلیمی کوششوں کو ترقی نہیں ہوئی ہے۔ شہر میں کوئی اچھا کتب خانہ نہیں۔ انگلستان یا فرانس یا دوسرے ممالک کے کتب خانوں میں آپ کو فارسی، عربی، ترکی کی بیش قیمت کتب نظر آئیں گی اور یہ تمام سرمایہ آپ کے بزرگوں کا ترکہ ہے۔ یہ آپ کا مال ہے جو آپ کی جیبوں سے چوری کیا گیا ہے۔ انگریزوں نے ہم سے نہ صرف مادی دولت کا استحصال کیا بلکہ علمی و ادبی دولت بھی لوٹی اور آپ کے بزرگوں کی تصنیفات و تالیفات کو چرا لے گئے۔ خلافت وفد کے ساتھ ۱۹۲۰ میں مجھے انگلستان جانے کا اتفاق ہوا تو انڈیا آفس دیکھنے کا بھی موقع ملا۔ وہاں میں نے میز پر پیتل کے بنے ہوئے کاغذوں کو دبانے کیلئے "پیپر ویٹ" دیکھے۔ وہ سلطان ٹیپو شہید کے تھے جن پر شیخ سعدیؒ کی نصیحتیں کندہ تھیں۔ میں نے ان شعروں کو نقل کر لیا اور وہ "معارف" میں چھپ گئے ہیں۔ آج کے پیپر ویٹ پر نقش و نگار اور خوبصورتی و نزاکت ضرور ملے گی لیکن نصیحتوں کا پتہ نہ ہوگا۔ کیا آپ نے کبھی ان علمی خزانوں کی طرف توجہ اور غور کیا۔ دیواروں پر تصویروں کے بجائے ہمارے پرانے طریقِ آرائش میں خوبصورت کتابت کا رواج تھا اور تصویروں کی طرح ان کی بھی بڑی بڑی قیمتیں تھیں مگر یہ تصویریں بداخلاقی سکھاتی ہیں وہ سراسر حکمت اور عبرت سکھاتے تھے۔

آج ہماری قوم و ملت پر ایک نازک دور ہے۔ ہم ایک دوراہے پر

کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ وقت بہت ہی غنیمت ہے۔ اگر آج ہم نے صحیح سمت میں قدم رکھا تو منزل قریب ہوگی اور ملّت ترقی کرے گی۔ اگر غلط طریقہ پر ہمارے قدم اُٹھے تو ہماری تباہی و بربادی یقینی ہوگی۔

اسلام عقائد و اعمال سے متشکل ہے۔ پانچ چیزوں پر ایمان لانا اسلام کی بنیاد ہے۔ اسکے بعد خیر و شر کا معاملہ آتا ہے اور خیر و شر کے احتیاط ہی پر زندگی کی بنیاد ہے۔ خیر کو کرنا اور شر سے بچنا چاہیئے۔ شر سے بچنے کے لئے خدا پر ایمان اور دل میں تقویٰ درکار ہے۔ جب تک یہ نہ ہوگا تب تک خیر حاصل نہ ہوگا لیکن یقین رکھیئے گا کہ پولیس اور فوج کے ذریعے شر اور جرائم کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ شر کا خاتمہ اس وقت ہو سکتا ہے جب یہ عقیدہ جاں گزیں ہو جائے کہ کوئی دیکھے نہ دیکھے خدا ضرور دیکھتا ہے۔ اب وحی و الہام کے ذرائع باقی نہیں رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے ذریعے ہم کو خیر و شر کا علم بخشا ہے۔ ہم بغیر ان کی تعلیم کے خیر و شر کے امتیازات کو نہیں سمجھ سکتے۔ آج دنیا میں جہاں کہیں بھی خیر کا وجود ہے وہ افلاطون و ارسطو کے خیالات کا نتیجہ نہیں بلکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت عیسیٰ و موسیٰ کی تعلیمات کا نتیجہ ہے کہ دنیا میں اخلاق موجود ہے۔ ہر کام حکمِ الٰہی سے ہوتا ہے۔ عالمِ کائنات بھی اس طرح سے بے جان ہے جس طرح سے یہ چیز۔ انسانی علم کی بھی ایک انتہا ہوتی ہے جس کے آگے عقل کام نہیں کر سکتی۔ مومن پہلے ہی قدم پر اللہ تعالیٰ کی قدرت اور مشیت پر ایمان لاتا ہے اور سائنسدان چار قدم آگے بڑھ کر 'ناقابلِ ادراک قوت' کہنے پر مجبور ہیں۔ پھر کیوں وہ خود کو صداقت پر اور دوسرے کو غلطی پر سمجھتے ہیں۔

فلسفی سرِّ حقیقت نہ توانست کشود

گشت رازے دگر آں راز کہ افشاں کرد

سائنس 'کیسے' کا جواب دے سکتا ہے۔ 'کیوں' کا جواب نہیں دے سکتا۔ سنکھیا سے انسان کیوں مرتا ہے؟ کافور سے کیوں نہیں مرتا؟ بظاہر ان کی شکل و صورت میں فرق نہیں مگر دونوں کی تاثیر مختلف ہے۔ آخر اس فرق کا باعث کوئی بتا سکتا ہے۔ یہ کہنا کہ خاصیت ان میں ودیعت کی گئی ہے بے ثبوت دعویٰ ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و مشیت ہر آن اس سے اپنی قدرت و مشیت کے مطابق اپنا حکم جاری کراتی رہتی ہے اور جب چاہے وہ اس سے اس کو سلب کر لے۔ اس نظریہ کی بنا پر معجزات کے جواز پر سائنس کے تمام اعتراضات کافور ہو جاتے ہیں۔

حضرات! بات طویل ہوتی جا رہی ہے، سلسلہ نکلتا آتا ہے۔ وقت زیادہ ہو چکا ہے اس لئے میں اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں اور آخر میں دعاگو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی کوششوں کو کامیاب فرمائے۔ بوڑھوں کے دل و دماغ سے تو ایک مدت کی غلامی کے سبب سے انگریزی غلامی کی بو نہیں نکل سکتی، لیکن مجھے اپنے نوجوان طلباء سے امید ہے کہ یہ ان غلامی کے احساسات سے ہر طرح آزاد اور پاک ہوں گے اور ان کے دل خدا کی غلامی اور اسلام کی خدمت کے جذبات سے معمور ہوں گے۔ آمین۔

—ooo—